(غلام گردش)

شکریہ، سنگھا صاحب!

تئیس جون 1947 کو پنجاب اسمبلی کا اجلاس برپا تھا۔ مشکل نکتہ پر اسمبلی نے جمہوری انداز یعنی ووٹ کے ذریعے فیصلہ دینا تھا۔ یہ حد درجہ نازک مرحلہ پنجاب کی پاکستان میں شمولیت کا تھا۔ پورے پنجاب کی بات ہو رہی ہے۔ یعنی مغربی اور مشرقی پنجاب۔ ہر صاحبِ نظر کو معلوم تھا کہ اگر پنجاب، نئے ملک پاکستان کا حصہ نہ بن پایا تو قائداعظم کیلئے وہ مشکلات کھڑی ہو جائینگی، جسکا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ تصور کیجئے کہ پورا پنجاب، یعنی لاہور اور دیگر شہر، اٹک تک قانونی طریقے سے انڈیا کے پاس ہوتے، تو ہمارے ملک کا کیا نقشہ ہوتا اور کیا حال ہوتا۔ اسمبلی میں گرما گرمی کا ماحول تھا۔ اچانک سکھ رہنما، ماسٹر تارا سنگھ نے نیام سے تلوار نکالی۔ زور سے نعرہ لگایا کہ اگر کسی نے پنجاب کی تقسیم کی بات کی یا کہا کہ پنجاب کو پاکستان کا حصہ بننا ہے، تو اسے قتل کر دونگا۔ پنجاب صرف اور صرف انڈیا کا حصہ بنے گا۔ سب ممبران سہم کر بیٹھ گئے۔ تمام لوگ تارا سنگھ کی طاقت کو جانتے تھے۔ کم از کم کسی مسلمان ممبر نے تو جرات نہیں کی کہ تارا سنگھ کی بات کا جواب دے۔ اچانک سفید گھڑی پہنے، ایک گھنی مونچھوں والے شخص نے جرات سے کہا، کہ پنجاب پاکستان کا حصہ بن کر رہیگا۔ دیکھتا ہوں کہ کون ہمت کرتا ہے کہ روک سکے۔ حد درجہ رعب دار والا شخص، ماسٹر تارا سنگھ کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا، کہ ہمت ہے تو چلاؤ اپنی تلوار، مقابلہ کرونگا۔ دونوں ممبران گھتم گھتا ہو گئے۔ بہت مشکل سے دیگر ممبران نے دونوں کو زخمی ہونے سے بچایا۔ یہ جرات اندانہ دکھانے والا عظیم انسان دیوان بہادر سنگھا تھا۔ جو مسیحی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ تاریخ کا ایک عظیم کردار، جسکو آج شائد کوئی بھی نہیں جانتا۔ یا بہت کم لوگ یاد رکھے ہوئے ہیں۔

معاملہ یہاں نہیں رُکا۔ پنجاب اسمبلی میں قرارداد پیش کی گئی۔ امکانات حد سے زیادہ تھے کہ پنجاب ہندوستان کے ساتھ ہی رہیگا۔ ووٹ پڑنے لگے۔ صوبہ کو ہندوستان کا حصہ بنانے کیلئے اَٹھاسی ووٹ آئے۔ لگتا یہی تھا کہ اتنے زیادہ ممبران کی موجودگی میں اب پنجاب کا نئے ملک میں شامل ہونا ناممکن ہوگا اور یہ شائد تقسیم بھی نہیں ہو پائیگا۔ بڑے بڑے مسلمان جاگیردار، کلغیوں والے امیر و کبیر سکھ، ہندو سیٹھ پوری شان و شوکت سے بیٹھے تھے۔ اب مبارک بادوں کا وقت قریب آ رہا تھا۔ جب سپیکر نے اعلان کیا کہ پنجاب کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے۔ اس پر ووٹنگ ہوگی۔ تو تقسیم کے حق میں بھی اَٹھاسی ووٹ ہی آئے۔ ان میں سے اکثریت مسلم لیگی ممبران کی تھی۔ اب پوری اسمبلی میں سنجیدہ قسم کی خاموشی بلکہ موت جیسی خوفناک خاموشی تھی۔ اب کیا ہوگا۔ پاکستان، پنجاب کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یا خدا، اب معاملہ کیسے سلجھے گا۔ اس ماحول میں دیوان بہادر سنگھا جو اسمبلی کے سپیکر بھی تھے، نے دارفتگی سے اعلان کیا، کہ میں، پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالتا ہوں۔ بطور سپیکر انکے ووٹ نے 88 کی گنتی کو ایک ووٹ سے بڑھا دیا۔ سنگھا صاحب کے ساتھ سیسل اور فضل الٰہی اُٹھے اور انہوں نے بھی پاکستان کی حمایت کر دی۔ یہ دونوں بھی مسیحی تھے۔ یعنی اب قرارداد صرف اور صرف تین ووٹوں سے کامیاب گردانی گئی۔ اکانوے ممبران نے پنجاب کو پاکستان کا حصہ بنانے کی حمایت کی۔ اور 88 ممبران نے اسکی مخالفت کی۔ اٹھاسی کی گنتی کو صرف تین ووٹوں سے شکست ہوئی۔ جس میں نمایاں ترین ووٹ سنگھا صاحب کا تھا۔ یہ تسلیم نہ کرنا کم ظرفی ہوگی، کہ پنجاب کا پاکستان سے الحاق

صرف اور صرف تین کرسچن ممبران اسمبلی کی بدولت ہو پایا۔سنگھا صاحب، قائداعظم کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ ہر جگہ کہتے تھے کہ ہندو مذہب، ذات پات پر کھڑا ہوا ہے۔اس میں مسیحوں کی عزت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ جناح صاحب، جو پاکستان بنا رہے ہیں، اس میں سبھی لوگوں کی ترقی کے بھرپور مواقع موجود ہونگے۔سنگھا صاحب، 1948 میں قائداعظم کی وفات کے ٹھیک ایک ماہ بعد، جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔انکا خاندان سنگھا صاحب کی وفات کے کچھ عرصے بعد ہی پاکستان سے ہجرت کر گیا۔مگر سچ صرف اور صرف یہ ہے کہ آج وہ پنجاب جو پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے، صرف اور صرف سنگھا صاحب کی بدولت اس ملک کا حصہ ہے۔ورنہ سب کچھ اتنا مختلف ہوتا، جسے تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔

موجودہ پاکستان کی داخلی صورتحال پر غور کیجئے۔کیا ہمارے ملک میں اقلیتیں محفوظ ہیں۔کیا آزادی سے اپنی زندگی گزار سکتی ہیں۔کیا انکے مذہبی عقائد اسی طرح ریاستی کی آئینی حفاظت میں ہیں، جس طرح مسلمانوں کے۔اس پر حد درجہ کھلی بحث درکار ہے۔دماغ کے دریچے کھول کر دلیل اور عقل کی بنیاد پر مکالمہ کی ضرورت ہے۔ویسے ہمارے سماج میں مکالمہ کی سزا تو موت ہے۔مگر پھر بھی ملک کو بچانے اور قائم رکھنے کیلئے اور دنیا کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کیلئے، یہ بحث از حد اہم ہے۔1947 میں، یعنی قائداعظم کے پاکستان میں تئیس فیصد اقلیتیں تھیں۔ان میں کرسچن، یہودی، ہندو، جینز، پارسی سب شامل تھے۔اور اب انکا تناسب سات سے آٹھ فیصد رہ گیا ہے۔کہاں تئیس فیصد اور کہاں یہ سات فیصد۔سوچنے کا مقام تو ہے کہ ہم نے اپنے ملک کے ساتھ آخر کیا کیا ہے۔کہ یہاں سے اقلیتوں کی اکثریت ہجرت کر چکی ہے یا شائد فرار ہو چکی ہے۔زندہ رہنے کی کوشش میں اپنا ملک چھوڑ چکی ہے۔یہ اَمر تو محض فریب ہے کہ ہمارے ملک میں اقلیتوں کے لیے تمام آئینی تحفظات حقیقت میں موجود ہیں۔اور ان پر عمل ہو رہا ہے۔نہیں صاحب، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ہم نے باقاعدہ پاکستانی اقلیتوں کے ساتھ ہر وہ ظلم روا رکھا ہے، جن سے انکا ہمارے نظام سے اعتماد ہی اُٹھ چکا ہے۔انکے پاس جان اور عزت بچانے کا واحد راستہ اس عجیب و غریب ملک سے جان بچا کر بھاگنا ہی رہ گیا ہے۔میری عمر کے لوگوں کا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم نے نسبتاً بہتر اور آزاد پاکستان دیکھا ہے۔لائل پور کی مثال دینا چاہونگا۔پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں وہاں ایسے کئی بہترین تعلیمی ادارے موجود تھے، جہاں مسیحی نُنز اور مسیحی اساتذہ بلاخوف تعلیم دیا کرتے تھے۔میری چھوٹی بہن، سیکرٹ ہارٹ سکول لائل پور میں پڑھی تھی۔یہ پورے ضلع میں لڑکیوں کا بہترین سکول تھا۔اس میں غیر ملکی ٹیچرز بھی موجود تھیں۔کسی کو اس سے واسطہ ہی نہیں تھا کہ یہ غیر مسلم ہیں۔جوہری نکتہ صرف ایک تھا کہ یہ خواتین، انتہائی عرق ریزی سے مقامی بچیوں کو پڑھاتی تھیں۔اگر کوئی لڑکی، کسی بھی مضمون میں کمزور ہوتی تھی، تو یہ سکول کے ٹائم کے بعد اسے مفت پڑھاتی تھیں۔لائل پور کی عرض کر رہا ہوں۔وہاں کے وہ تعلیمی ادارے جن میں مسیحی ٹیچرز تھیں، تعلیمی میدان میں دوسرے سکولوں سے حد درجہ بہتر تھے۔ڈویژنل پبلک سکول کا بھی یہی حال تھا۔کسی طالبعلم کو اس سے غرض نہیں تھی کہ ڈیسک پر ساتھ بیٹھا ہوا بچہ مسلمان ہے یا غیر مسلم۔یقین فرمایئے۔وہم و گمان ہی سے باہر تھا کہ صرف عقیدہ اور مذہب کی بنیاد پر کسی بھی بچے سے نفرت کی جائے۔پتہ نہیں اب کیا حال ہے۔کیونکہ میں تو پچھلی صدی کی بات کر رہا ہوں۔تعلیمی ادارہ میں کرسچن ٹیچرز کی موجودگی اس بات کی دلیل تھی کہ یہاں معیارِ تعلیم بہت بہتر ہے۔یہ نہیں کہ مسلمان اساتذہ اچھی طرح نہیں پڑھاتے تھے۔وہ بھی طالبعلموں پر حد درجہ محنت کرتے

تھے۔ بالکل اسی طرح کیڈٹ کالج حسن ابدال میں تاریخ پڑھانے والے استاد، جناب جی لارنس تھے۔ بہت بڑے تاریخ دان اور حد درجہ شفیق انسان، کبھی کسی بھی طالبعلم نے یہ نہیں سوچا کہ ہمارا ٹیچر کرسچن ہے۔ 1972 کی بات کر رہا ہوں۔ یہ سوچ ہی نہیں تھی کہ مذہب کی بنیاد پر کسی بھی انسان سے اَبتر سلوک کیا جا سکتا ہے۔

لاہور کی طرف آیئے۔ بھلے وقتوں میں لاہور میں سب سے بہترین ہسپتال یو۔سی۔ایچ تھا۔ شہر کی سب سے نمایاں جگہ یعنی گلبرگ میں موجود، یہ وسیع و عریض ہسپتال کسی بھی اعتبار سے کسی بھی مقامی ہسپتال سے کمتر نہیں تھا۔ یہاں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے انسان کا مفت یا بہت کم پیسوں میں علاج کیا جاتا تھا۔ خیر ہم نے اقلیتوں کو تو زندہ درگور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہی ہے۔ مگر ہم نے یوسی ایچ جیسے بڑے ادارے کو بھی غیر فعال کر دیا ہے۔ اب اسکی بیش قیمت زمین پر قبضہ مافیا کی نظر ہے۔ جو کسی نہ کسی بہانے سے یہ اربوں کی زمین ہتھیانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یوسی ایچ کو جانے دیجئے۔ ایف سی کالج کا ذکر کیے بغیر، لاہور کا ذکر نامکمل ہے۔ ایف سی کالج میں زیرِ تعلیم نہیں رہا۔ مگر بہت سے دوست وہاں پڑھتے تھے۔ انکو ملنے اکثر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ ایف سی کالج کے ہوسٹل کے ای کے ہوسٹلز سے بہت بہتر اور اعلیٰ تھے۔ ایف سی کالج میں غیر ملکی اساتذہ کافی تعداد میں موجود تھے۔ سنا ہے پھر اسے قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ بہر حال اس ناکام تجربہ کے بعد ایف سی کالج کو دوبارہ انہی مسیحی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا ہے، جنہوں نے اس جیسے عظیم ادارے کو بنایا تھا۔ آج بھی وہ لاہور کے، بلکہ پاکستان کے عمدہ ترین تعلیمی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انارکلی کے شروع، یا نیلا گنبد کے سامنے یوئنگ ہال نام کا ہوسٹل تھا۔ یہ 1916 میں بنایا گیا تھا۔ اور یہ طلباء کیلئے اعلیٰ ترین ہوسٹل تصور کیا جاتا تھا۔ کمرے حد درجہ شاندار تھے۔ اسکو بیچنے اور ارزاں داموں پر خریدنے کی کافی سازشیں ہوئی ہیں۔ مگر بہر حال یہ ہاسٹل آج بھی شاد ہے۔

پاکستان کے کسی کونے میں چلے جایئے۔ غیر مسلموں کے بنائے ہوئے ہسپتال، تعلیمی ادارے، سڑکیں، پُل، فلاحی ادارے نظر آئینگے۔ لاہور تو خیر ہے ہی سرگنگا رام کی محنت کا ثمر۔ مگر ہم نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ ہرگز ہرگز انصاف نہیں کیا۔ انہیں سماجی سطح پر برابر تک تسلیم نہیں کیا۔ ہم اتنے ظالم لوگ ہیں، کہ انکے اداروں کے نام بدلنے کی بھی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اقلیتیں اور بالخصوص انکی بچیاں اور خواتین، کمزور ہونے کی بدولت ہمارے ظلم کا سب سے اولین نشانہ ہیں۔ مذہب تبدیل کروانے سے لیکر، انکی کمزور سماجی حیثیت کا فائدہ اُٹھانا شائد ہمارے ناقص نظام کا حصہ ہے۔ ہمارے آئین میں درج شدہ اقلیتوں کے حقوق صرف کاغذ پر چھپے ہوئے بیجان لفظ ہیں۔ جن پر کبھی بھی کوئی عمل نہیں کرتا۔ مگر ذرا غور کیجئے کہ اگر دیوان بہادر سنگھا نہ ہوتا تو پاکستان کس جغرافیائی حالت میں ہوتا۔ یقین ہے کہ آج سنگھا صاحب کی روح کسی خوشبودار بادل کے اوپر بیٹھی اپنے ووٹ سے قائم کردہ خطے کو غور سے دیکھ رہی ہوگی۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں۔ شکریہ، سنگھا صاحب!

راؤ منظر حیات